بھوتوں کا جہاز

مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

بھوتوں کا جہاز

شمیم حنفی

مکتبہ پیامِ تعلیم۔ جامعہ نگر۔ نئی دلّی ۲۵

تقسیم کار
صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

جنوری ۱۹۹۲ء تعداد ۱۰۰۰۰ قیمت 7/50

برٹی آرٹ پریس (پرنٹر پبلشرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، چوڈی ہاؤس، دیا گنج، نئی دہلی) میں طبع ہوئی۔

اِس کہانی کی کہانی

بہت برس گزرے، اب سے کوئی سولہ برس اُدھر، جب ان کہانیوں سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اُن دنوں میں اندور میں تھا۔ ایک دوست کے جی میں آیا کہ بچّوں کے لیے ہندی میں اخبار نکالا جائے۔ سو، بچّوں کا اخبار نکلا اور اس رنگ و روپ کے ساتھ کہ بچّوں کے ساتھ بڑے بھی اسے شوق سے پڑھتے تھے۔ یہ کہانیاں سب سے پہلے اسی اخبار میں چھپیں۔

الف لیلہ کی کہانیاں آپ نے سنی ہوں گی۔ ان میں ایک کہانی سے دوسری، دوسری سے تیسری، تیسری سے چوتھی کہانی کا سرا ملتا جاتا ہے اور واقعات کا تار کہیں ٹوٹتا نہیں۔ یہی حال ان کہانیوں کا ہے۔ یہ الگ الگ اپنی جگہ مکمّل بھی ہیں اور ایک دوسرے سے جڑی ہوئی بھی ہیں۔

پیامِ تعلیم کے لیے جب مجھے کہانیوں کا ایک سلسلہ تیار کرنے کی دعوت ملی تو سب سے پہلے اِنھی کہانیوں کا خیال آیا۔ اب میں نے اُردو میں نئے سرے سے اُن کا ترجمہ شروع کیا۔ دو تین قسطیں بھیجی تھیں کہ بچّے اور اُن سے زیادہ بچّوں کے بزرگ اس سلسلے کو آگے بڑھانے کا تقاضا کرنے لگے۔ مجھے بھی مزا آنے لگا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ڈھائی برس تک مسلسل یہ کہانیاں پیامِ تعلیم میں چھپتی رہیں۔

کہانی سننے سنانے کی چیز ہے۔ میری کوشش بھی یہ رہی ہے کہ ان کہانیوں میں لکھنے کے بجائے سنانے کا انداز قائم رہے۔ ہماری پرانی کہانیوں میں یہ انداز ہمیشہ محفوظ رہا۔

اِن کہانیوں کی اشاعت کے لیے برادرم شاہد صاحب اور ولی صاحب قبلہ کا شکر گزار ہوں۔ اپنی بیٹیوں غزل اور سیمیں کا بھی جو ہر قسط کا ترجمہ چھپنے سے پہلے ہی پڑھتی تھیں اور اُس پر اپنی رائے دیتی تھیں۔

بسیرا
جامعہ نگر، نئی دلّی

شمیم حنفی
یکم جولائی ۸۱ء

بہت دن ہوئے

بہت دنوں پہلے کی بات ہے، ایک لمبا چوڑا قافلہ ریگستان سے گزرتا چلا جا رہا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی زمین پر ریت بچھی ہوئی اور سر پر نیلا آسمان تھا۔ اور گھوڑوں کی گردن سے

لٹکتی ہوئی گھنٹیوں کی گونج دور دور تک سُنائی دیتی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد کے بادل اڈتے اور سارا منظر چھپ سا جاتا۔ ہوا کا کوئی جھونکا اس بادل کو اڑا لے جاتا تو گھوڑسواروں کے زرق برق لباس اور ہتھیاروں کی چمک دکھائی دیتی۔

سامنے سے ایک سوار دھیرے دھیرے قافلے کی طرف بڑھتا آتا تھا۔ اس کے عربی گھوڑے پر زین کی جگہ چیتے کی کھال پڑی ہوئی تھی۔ گھوڑے کی لگام چاندی کی گھنٹیوں سے سجی ہوئی تھی اور گھوڑے کی پیشانی پر رنگین پروں کی کلغی تھی۔ سوار بھی اپنے گھوڑے ہی کی طرح چست، مضبوط اور شاندار نظر آتا تھا۔ اس کے سر پر ایک سفید پگڑی تھی، سنہرے تاروں سے آراستہ۔ پاجامہ گہرے، چمکیلے سرخ رنگ کا تھا اور بائیں کاندھے سے اس نے ایک خوبصورت تھیلا لٹکا رکھا تھا۔ گھنے ابروؤں کے نیچے روشن سیاہ آنکھیں تھیں۔ خوب اُبھری ہوئی ناک اور لمبی کالی داڑھی نے اس کے چہرے کو بہت رعب دار بنا دیا تھا۔ اس وقت جب وہ کوئی پچاس گز کے فاصلے پر رہا ہوگا، اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور پلک جھپکتے میں قافلے

کے پاس آپہنچا۔ دور دور تک پھیلے ہوئے سنسان دشت میں ایک اجنبی سوار کو دیکھ کر قافلے کے پہرے دار چونکے۔ انھوں نے اچانک اپنے نیزے سوار کے سینے کی طرف تان دیے۔

"شکریہ دوستو، اس خیر مقدم کا!" سوار نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

"شاید تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں اکیلا ابھی تمھارے پورے قافلے پر حملہ کر بیٹھوں گا ——!"

پہرے داروں نے شرما کر اپنے نیزے جھکا لیے۔ پھر ان کا کماندار آگے بڑھا اور سوار سے پوچھا —— "تم کیا چاہتے ہو؟"

اس قافلے کا مالک کون ہے؟" سوار نے دریافت کیا۔

"کئی مالک ہیں ——" کماندار —— "مکّہ سے کئی سوداگر اپنے وطن کی طرف واپس آرہے ہیں۔ کبھی کبھی اس ریگستان میں لٹیرے قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں اس لیے ہم ان کی حفاظت کر رہے ہیں ——"

"مجھے ان سوداگروں کے پاس لے چلو!" سوار نے کہا۔

"ابھی تو یہ ممکن نہیں!" کماندار نے جواب دیا —— "وہ لوگ ابھی کافی پیچھے ہیں اور ہم یہاں رک کر ان کا انتظار نہیں کر سکتے۔ لیکن، اگر تم چاہو تو ہمارے ساتھ چلو ——

سہ پہر کو جب ہمارا قافلہ پڑاؤ ڈالے گا تو تمھاری خواہش پوری کر دی جائے گی!"

سوار نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ کماندار کے ساتھ ہو لیا۔ کماندار کچھ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ سوار سے اس کا نام اور ملاقات کا مقصد پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ اُس نے سوار سے اگر کوئی بات کرنی بھی چاہی تو اسے سوار نے بس ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔

آخر کار وہ اس مقام پر جا پہنچے جہاں قافلے کو رات گزارنی تھی ——— کماندار نے پہرے داروں کو چوکنا رہنے کی ہدایت کی اور سوار کے ساتھ قافلے والوں کا انتظار کرنے لگا ——— سب سے آگے تیس اونٹوں کی ٹکڑی آئی جن کے کجاوے پر بھاری گٹھڑ لدے ہوئے تھے اور ہتھیار بند سپاہی ان کی حفاظت پر مامور تھے۔ اونٹوں کے پیچھے خوب صورت گھوڑوں پر اس قافلے کے مالک یعنی پانچوں سوداگر تھے۔ ان میں چار خاصے سن رسیدہ اور سنجیدہ دکھائی دیتے تھے۔ پانچواں نسبتاً کم عمر تھا اور صورتاً شوقین مزاج نظر آتا تھا۔ پانچوں سوداگروں کے پیچھے بھی باربردار اونٹوں

اور خچروں کی ایک لمبی قطار تھی۔

خیمے گاڑ دیے گئے۔ اونٹوں اور خچروں کی پیٹھ سے سامان اتار کر انھیں سستانے کے لیے کھول دیا گیا۔ بیچوں بیچ نیلے ریشمی کپڑے کا ایک بہت بڑا خیمہ نصب کر دیا گیا۔ کماندار نے سوار سے اسی خیمے کی طرف چلنے کی درخواست کی۔

دونوں آگے بڑھے۔ کماندار نے خیمے کا پردہ اٹھایا اور دونوں اندر چلے گئے۔ وہاں پانچوں سوداگر سنہری گدّے دار کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، حبشی غلام ان کے سامنے کھانے پینے کی چیزیں پیش کرنے میں مصروف تھا۔

"یہ تم کسے لے آئے ہو؟" نسبتاً کم عمر سوداگر نے کماندار سے تحکمانہ لہجے میں دریافت کیا۔

اس سے پہلے کہ کماندار جواب دیتا سوار نے خود ہی بولنا شروع کر دیا ——— "میرا نام سلیم ہے اور میں قاہرہ کا رہنے والا ہوں۔ مکّہ سے واپسی کے سفر میں لٹیروں کی ایک ٹولی نے مجھے قید کر لیا ——— بڑی مشکلوں سے میں تین دن پہلے انھیں چکمہ دے کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔ خدا کا شکر ہے اس قافلے کی گھنٹیوں کی گونج سُن کر جان میں جان آئی میری درخواست صرف یہ ہے کہ مجھے آپ لوگ

اپنے ساتھ سفر کرنے کی اجازت دے دیں، میں آپ کی ہمدردی کا مستحق ہوں۔ قاہرہ پہنچ کر میں آپ لوگوں کی اس محبت کے اعتراف کے طور پر آپ کی خدمت میں ایک نذرانہ بھی پیش کروں گا۔ قاہرہ کے وزیر اعظم میرے ماموں ہیں۔"

سب سے بوڑھے سوداگر نے غور سے سنا ــــ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ــــ "ٹھیک ہے! ٹھیک ہے! ہم تمھیں اپنے ساتھ لے چلیں گے ــ اب آؤ! بیٹھو اور ہمارے ساتھ کھاؤ پیو!" سوار بیٹھ گیا اور ان کے ساتھ خورد و نوش میں شریک ہو گیا۔ دسترخوان، قسم قسم کے لذیذ کھانوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ سب کھانے سے فارغ ہو چکے تو حبشی غلاموں نے دسترخوان سمیٹ کر خوشبودار تمباکو کے تازہ دم حقے اور تر کی مشروبات کی صراحیاں سامنے

سجا دیں۔ کچھ دیر پانچوں سوداگر اور یہ اجنبی سوار چپ چاپ ایک دوسرے سے بے نیاز حقے کے کش لیتے رہے، بالآخر سب سے کم عمر سوداگر نے مہر سکوت توڑی اور بولا۔

"ہمیں تین دن اس طرح سفر میں گزر گئے۔ یا تو گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے رہے یا پھر کھایا پیا اور سو گئے۔ وقت گزاری کا کوئی اور طریقہ اب تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اب اس عالم میں میری طبیعت اکتانے لگی ہے۔ یہاں نہ تو رقص و سرود کی محفل آراستہ ہو سکتی ہے نہ ہی دل کو بہلانے کا کوئی اور بہانہ نظر آتا ہے۔ آپ لوگ ذرا غور کیجیے ــــ وقت گزارنے کی کوئی اور صورت آپ کے ذہن میں ہے؟"

چاروں بوڑھے سوداگر تو یہ سن کر خاموش رہے اور بیٹھے اسی طرح لاپروائی سے حقے کے کش لیتے رہے، لیکن سوار نے ایک تجویز پیش کی ــــ بولا:

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ جہاں جہاں ہمارا قافلہ پڑاؤ ڈالے ہم میں سے کوئی بھی ایک دلچسپ قصہ سنائے اس طرح وقت بھی کٹ جائے گا، تفریح بھی رہے گی!"

"تم ٹھیک کہتے ہو!" سب سے بوڑھے سوداگر احمد

نے کہا ـــــ "یہ مشورہ بہت عمدہ ہے!"

"بہت خوب، شکریہ!" سلیم نے جواب دیا۔ "چونکہ یہ تجویز میں نے پیش کی ہے اس لیے سب سے پہلے میں ہی قصہ بھی سناؤں گا!"

پانچوں سوداگر سوار کے اور قریب سمٹ آئے۔ غلاموں نے خالی صراحیوں میں شربت بھر دیا۔ حقّے کا تمباکو بدل کر چلموں میں دہکتے ہوئے کوئلے ڈال دیے۔ سلیم نے شربت کے دو تین بڑے بڑے گھونٹ لیے، اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"اچھا تو پھر سنو! ایک عجیب و غریب واردات۔ یہ قصہ سارس بادشاہ کا ہے۔"

سارس بادشاہ

بہت دنوں پہلے کی بات ہے، ایک روز بغداد کے خلیفہ ہارون رشید تیسرے پہر کے وقت دیوان پر مسند سے ٹیک لگائے آرام کر رہے تھے۔ دن بھر کے کام کاج نے انھیں تھکا ڈالا تھا۔ اس وقت وہ قہوے کی چسکیوں کے ساتھ ساتھ حقّے کے کش لگا رہے تھے۔

ان کا وزیر اعظم منصور روزانہ اسی وقت ان سے ملاقات کے لیے آتا تھا۔ آج جب وہ آیا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ خلیفہ نے حقے کی نے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے منصور؟ تم کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو؟"

وزیر نے دھیمے لہجے میں کہا ——— "حضور! مجھے پتہ نہ تھا کہ چہرے سے آپ میرے دل کا حال جان جائیں گے۔ بات کوئی خاص نہیں۔ محل کے باہر ایک سوداگر کچھ بہت خوبصورت چیزیں بیچ رہا ہے۔ میں ان میں سے ایک آدھ خریدنا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت میری جیب بالکل خالی ہے!"

خلیفہ نے ایک خادم کو حکم دیا کہ باہر جا کر سوداگر کو بلا لائے۔ سوداگر چند لمحوں بعد اندر آیا۔ وہ ایک ٹھگنے قد کا موٹا سا آدمی تھا۔ اس کا لباس بہت معمولی اور پرانا تھا۔ اس نے کچھ انگوٹھیاں، جواہرات، جڑاؤ طپنچے، خوبصورت پیالے اور کنگھیاں سامنے رکھ دیں۔ خلیفہ نے وزیر کے لیے ایک طپنچہ خریدا اور وزیر کی بیوی کے لیے ایک خوبصورت کنگھی

اچانک خلیفہ کی نظر ایک ننھے سے صندوقچے پر پڑی جس میں سیاہ رنگ کا کوئی سفوف رکھا ہوا تھا اور ایک کاغذ جس پر کچھ عجیب و غریب سی لکھاوٹ تھی۔

"یہ کیا ہے؟" خلیفہ نے سوداگر سے پوچھا۔

"جہاں پناہ! میں خود نہیں جانتا کہ اس صندوقچے میں یہ کیا رکھا ہوا ہے۔ مکّہ کے ایک سوداگر نے مجھے یہ صندوقچہ دیا تھا۔ آپ کو پسند ہو تو آپ کی نذر ہے۔"

خلیفہ کو پرانی اور انوکھی تحریروں سے خاص دلچسپی تھی۔ اس نے وہ کاغذ لے لیا اور سوداگر کو رخصت کر دیا۔ پھر وزیر سے دریافت کیا ———

"کیا تم یہ تحریر پڑھ سکتے ہو ———!"

وزیر نے جواب دیا ——— "جی نہیں ——— مگر بڑی مسجد کے قریب ایک شخص رہتا ہے۔ اس کا نام سلیم ہے۔ اسے بہت سی پرانی زبانیں آتی ہیں شاید وہ پڑھ لے!"

خلیفہ نے اسی وقت سلیم کو بلوا بھیجا۔ سلیم چند لمحوں بعد آ پہنچا۔ خلیفہ نے کہا ——— "لوگ تمھیں

عالم کہتے ہیں ـــــ اس کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ کر اس کا مطلب بتاؤ! اگر تم کامیاب ہوئے تو انعام پاؤ گے۔ نہیں تو تمھیں سزا دی جائے گی!"

سلیم نے ایک نظر اس کاغذ پر ڈالی۔ پھر کہا۔

"یہ تحریر لاطینی زبان میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی صندوقچے میں رکھے ہوئے سفوف کو سونگھ کر "معتبر" کہے گا اس کی شکل اپنے آپ اس کی پسند کے کسی جانور کی شکل میں تبدیل ہو جائے گی اور وہ جانوروں کی بولی بھی سمجھنے لگے گا۔ پھر جب وہ دوبارہ انسان بننا چاہے تو مشرق کی طرف تین بار سر جھکا کر اسے لفظ "معتبر" کہنا پڑے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ جانور کی شکل اختیار کرنے کے بعد وہ بھولے سے بھی مسکرانے کی کوشش نہ کرے۔ نہیں تو ہمیشہ جانور ہی رہے گا۔"

سلیم کے خاموش ہوتے ہی خلیفہ نے بہت پرجوش انداز میں اس کو شاباشی دی۔ اسے انعام و اکرام بھی دیا اور اس سے یہ عہد کروایا کہ وہ کسی کے سامنے اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں کرے گا۔

سلیم کے جانے کے بعد خلیفہ نے وزیر سے کہا ـــ

"منصور! یہ تو بہت شاندار چیز ہمارے ہاتھ لگی ہے۔ کل صبح تم یہاں آجاؤ۔ پھر کسی سنسان جگہ پر چل کر ہم اس سفوف کا تجربہ کریں گے ـــــ"

دوسرے دن خلیفہ صبح کے ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ وزیر آپہنچا۔ خلیفہ نے اپنے مسلح باڈی گارڈ کو حکم دیا کہ صندوقچہ لے کر اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ کچھ دیر دونوں محل کے گرد پھیلے ہوئے باغوں میں کسی جاندار مخلوق کی تلاش کرتے رہے۔ اس تلاش میں ناکامی ہوئی تو منصور نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ جھیل کی طرف چلا جائے۔ وہاں سارس، بگلے اور دوسرے آبی پرندے ضرور موجود ہوتے ہیں۔

خلیفہ نے منصور کی بات مان لی۔ دونوں جھیل کی طرف چل پڑے ابھی وہ کنارے تک پہنچے ہی تھے کہ انھیں ایک سارس نظر آیا جو اپنی لمبی چونچ زمین پر جھکائے مینڈکوں کی تلاش میں مصروف تھا۔ ایک اور سارس ہوا میں اڑتا ہوا دکھائی دیا۔

وزیر نے پرجوش انداز میں کہا ـــــ "یہ دونوں سارس ابھی آپس میں غپ لڑائیں گے کیوں نہ ہم

خود کو سارس میں تبدیل کرلیں۔"

"ٹھیک ہے ——!" خلیفہ نے منصور کی تائید کی ——" لیکن پہلے ہم یہ اچھی طرح یاد کرلیں کہ جب ہم دوبارہ آدمی بننا چاہیں تو ہمیں کیا کرنا ہوگا —— کیوں ——؟ ہاں! ہمیں مشرق کی طرف تین مرتبہ سر جھکا کر ایک لفظ کہنا ہوگا —— "معتبر" —— لیکن یہ خیال رہے کہ کسی بھی طرح ہنسی نہ آنے پائے نہیں تو ہم سارس ہی بنے رہ جائیں گے!"

اتنے میں اوپر اڑتا ہوا سارس دھیرے دھیرے پروں کو سمیٹتا ہوا نیچے اترا۔ خلیفہ نے جلدی سے صندوقچہ کھولا۔ چٹکی بھر سفوف نکال کر سونگھا اور پھر ایک چٹکی بھر سفوف منصور کی طرف بڑھا دیا۔ پھر دونوں مشرق کی سمت تین بار جھکے اور ایک ساتھ چلائے۔

"معتبر!"

اچانک دونوں تیزی سے بدلنے لگے ان کے پاؤں لمبی لال چھڑیوں جیسے ہوگئے۔ پیلے رنگ کی چپلیں سارس کے پنجوں میں تبدیل ہوگئیں۔ بازو ڈینے بن گئے

گردن لمبی ہوگئی۔ ڈاڑھیاں غائب ہوگئیں اور سارے بدن پر نرم نرم سفید پر اُگ آئے۔

"واہ! تمھاری چونچ کتنی خوبصورت ہے!" خلیفہ نے تعریفی انداز میں وزیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شکریہ حضور!" منصور نے بڑے ادب سے کہا۔ پھر بولا ــــ "اگر آپ اجازت دیں تو یہ عرض کروں کہ آپ سارس کی شکل میں اپنی اصل صورت سے زیادہ شاندار نظر آرہے ہیں۔ اب ہم ذرا ان سارسوں کے پاس چل کر ان کی باتیں سنیں۔ ذرا یہ دیکھیں کہ ہم ان کی بولی سمجھ پاتے ہیں یا نہیں ــــ!"

ہوا میں اُڑتا ہوا سارس زمین پر اترنے کے بعد چونچ سے اپنے پاؤں صاف کر رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے پَر جھاڑے اور دوسرے سارس کی طرف بڑھا۔

"کہو دوست کیا حال ہے ــــ؟" پہلے سارس نے دوسرے سارس سے پوچھا۔

"خدا کا شکر ہے دوست! میں ذرا اپنے ناشتے کا انتظام کر رہا تھا۔ کہو تو تمھیں بھی ایک آدھ مینڈک یا چھپکلی کی ٹانگ پیش کروں ــــ!"

"بہت بہت شکریہ بھائی! آج پتا نہیں کیوں بالکل بھوک نہیں ہے۔ میں تو بس یونہی کچھ دیر یہاں

سکون سے گزارنے کے لیے چلی آئی۔ آج میرے والد کے کچھ مہمان آنے والے ہیں۔ مجھے ان کے سامنے رقص کرنا ہوگا۔ تھوڑی سی مشق کرلوں۔"

یہ کہتے کہتے اس نے ناچنا شروع کر دیا۔ خلیفہ اور وزیر انھیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی باتیں سن کر انھیں یہ پتا چلا کہ ان میں ایک سارس نر ہے اور ایک مادہ۔ مادہ سارس اپنی لمبی گردن ہلا ہلا کر بڑے جوش کے ساتھ ناچنے میں مگن تھی۔ نر سارس اس کی طرف تحسین آمیز انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اچانک مادہ سارس نے ناچتے ناچتے اپنی ایک ٹانگ اوپر اٹھالی اور دوسری ٹانگ پر کھڑی ہوکر چک پھیریاں لینے لگی۔ وہ ایک ہی جگہ چکّر کاٹتی جاتی تھی اور اپنے پروں کو پنکھوں کی طرح ہلا رہی تھی۔

اس کو ناچ میں اتنا مگن دیکھ کر خلیفہ اور وزیر دونوں زور سے ہنس پڑے۔ ہنسی کی آواز نے دونوں کو ڈرا دیا۔ جلدی سے انھوں نے اپنے پر کھولے اور یہ جا، وہ جا! بڑی مشکل سے خلیفہ اور وزیر نے اپنی ہنسی روکی۔

"واہ بھئی واہ! کیا شاندار رقص تھا!" خلیفہ نے کہا۔

پھر اچانک وزیر کو یاد آیا کہ انھیں ہنسنا نہیں چاہیے

تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"حضور ——!" وہ چیخ کر بولا —— "ہم سے بڑی بھول ہوئی —— ہمیں ہنسنا نہیں چاہیے تھا —— اب ہم شاید دوبارہ آدمی نہ بن پائیں!"

خلیفہ یہ سنتے ہی ڈر سے کانپ اٹھا —— "کیا کیا؟" اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا —— "ہمیں ہنسنا نہیں چاہیے تھا —— ہمیں ہنسنا نہیں چاہیے تھا —— اف! یہ کیا ہوا —— وہ کیا لفظ تھا ——؟ تین بار مشرق کی طرف سر جھکا کر کچھ کہنا تھا نا؟ یاد کرو! کیا لفظ تھا وہ ——؟ —— مع، مع، مع!"

دونوں مشرق کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو گئے —— تین بار اپنے اپنے سر جھکائے۔ ہزار کوشش کی لیکن وہ لفظ یاد نہ آیا —— اب کیا ہو گا؟ کیا وہ پھر سے آدمی نہ بن سکیں گے ——؟ دونوں اپنی حالت پر رو دیے!

خلیفہ اور وزیر منصور، دونوں سارس بنے، دن بھر کھیتوں میں اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح اپنی اس حالت سے نجات پائیں اور دوبارہ آدمیت کے جامے میں واپس آئیں۔ واپس شہر آنے کی ان میں ہمت نہ تھی۔ بھلا

کون یقین کرے گا کہ وہ سارس نہیں بلکہ خلیفہ اور وزیر ہیں! اگر وہ کسی طرح لوگوں کو اپنی اصلیت کا یقین دلا بھی دیں تو کون چاہے گا کہ ملک کا انتظام دو سارسوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے ——؟

کئی روز تک وہ اسی طرح مارے مارے پھرتے رہے۔ بھوک لگتی تو باغوں میں جا کر پھل کھا لیتے۔ لمبی لمبی چونچوں سے پھل کترنا انھیں بہت مشکل لگتا تھا۔ لیکن چھپکلی یا مینڈک کھانے کے تصوّر سے بھی ان کا جی متلانے لگتا تھا۔ ان کے لیے دل بہلانے کی صرف ایک صورت تھی —— یہ کہ بغداد کی حویلیوں کے اوپر کچھ دیر اُڑ لیں اور اپنے شہر کا حال دیکھ لیں۔

اِدھر شہر کے لوگ حیران تھے کہ بادشاہ اور وزیر اچانک کہاں چلے گئے۔ انھیں زمین کھا گئی کہ آسمان۔ ان کے غائب ہونے پر شہر والوں نے تین دن تک ان کا سوگ منایا۔ چوتھے دن اپنی اُڑان کے دوران خلیفہ اور وزیر نے شہر کی طرف نظر دوڑائی تو کیا دیکھا کہ ایک شاندار جلوس سڑک پر چلا جا رہا ہے —— ڈھول تاشے بج رہے ہیں۔ جلوس کے آگے آگے ایک

خوب سجا دھجا گھوڑا ہے۔ گھوڑے پر ایک شخص سنہرا زرتار لباس پہنے شان سے بیٹھا ہوا ہے، اس کے پیچھے خادموں کی صف ہے۔ صف سے پیچھے شہر کی آبادی کا ہجوم، اور لوگ نعرے لگا رہے ہیں۔

"مرزا، زندہ باد!"

"شاہ بغداد، زندہ باد!"

خلیفہ اور وزیر نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر خلیفہ نے کہا:

"منصور! دیکھو مجھ پر یہ کیسا قہر نازل ہوا ہے! یہ مرزا جو گھوڑے پر سوار ہے میرے سب سے بڑے دشمن کشنو جادوگر کا بیٹا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے جادوگر کو کسی بات پر سزا دی تھی اور اس نے عہد کیا تھا کہ کبھی نہ کبھی پلٹ کر مجھ سے بدلہ ضرور لے گا ــــ خیر ــــ میں ابھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں ــــ چلو ــــ! ہم ایک بزرگ کی قبر پر چل کر دعا کرتے ہیں۔ شاید اللہ ہماری سن لے۔"

دونوں نے ایک سمت اڑان بھری۔ تھکن سے حالت خراب ہو رہی تھی۔ لمبی اڑان کا یہ پہلا موقع تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وزیر کی طاقت جواب دے گئی۔ اس نے ہانپتے

ہوئے کہا ــــ "حضور! اب مجھ سے نہیں اڑا جاتا۔ آپ مجھ سے تیز اڑتے ہیں۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ پھر شام ہونے کو آئی۔ ہمیں کہیں نہ کہیں رات بسر کرنے کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔ کیوں نہ ہم بقیہ سفر کل پر چھوڑ دیں؟"

خلیفہ پر بھی تھکن چھائی ہوئی تھی۔ منصور کی تجویز سے اس نے اتفاق کیا۔ نیچے وادی میں انھیں کچھ کھنڈر دکھائی دیے۔ دونوں نے وہیں رات گزارنے کا قصد کیا اور زمین پر اتر آئے۔

یہ کھنڈر کسی زمانے میں قلعہ رہا ہوگا۔ لمبے لمبے ستون، خوبصورت محرابیں، اکّا دکّا چھتیں ابھی باقی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی زمانے میں یہ جگہ بہت شاندار رہی ہوگی ــــ دونوں ایک راہداری سے گزرتے ہوئے ایک موڑ پر پہنچے اور اچانک منصور کے پانو جم سے گئے۔

"حضور والا ــــ!" منصور نے سرگوشی کے انداز میں کہا ــــ "ہو سکتا ہے آپ اسے بے وقوفی کی بات سمجھیں، مگر ابھی ابھی میں نے ایک عجیب سی آواز سنی ہے۔ جیسے کوئی کراہ رہا ہو۔ مجھے بھوتوں سے بہت ڈر لگتا ہے ــــ"

خلیفہ بھی ٹھہر گیا اور اس نے بھی کان لگائے تو ویسی

ہی آواز سنائی دی۔ یہ کسی جانور کی بجائے کسی انسان کی آواز محسوس ہوتی تھی۔ حقیقت جاننے کے لیے خلیفہ آواز کی سمت میں تیزی سے بڑھا لیکن منصور نے فوراً اس کے پر مضبوطی سے پکڑ لیے اور درخواست کی کہ یوں بلا جانے بوجھے وہ جان خطرے میں نہ ڈالے۔ خلیفہ نے سنی ان سنی کر دی۔ اس نے جھٹک کر اپنے پر منصور کی چونچ سے چھڑائے اور اسی اندھیری سمت میں چل پڑا۔ آگے اسے ایک دروازہ دکھائی دیا جو پورا کھلا ہوا تھا۔ دروازے کے پیچھے سے وہ آوازیں آ رہی تھیں۔ خلیفہ اپنی چونچ دروازے کے ایک پٹ سے لگائے چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ دروازے کے پیچھے ایک کمرہ سا تھا۔ ایک دیوار میں کھڑکی تھی جس سے کچھ روشنی اندر آ رہی تھی۔ خلیفہ نے جھانک کر دیکھا تو فرش پر ایک بڑا سا اُلّو نظر آیا۔ اُلّو کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ وہ اپنی مڑی ہوئی چونچ جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

جیسے ہی اُلّو کی نظر خلیفہ اور منصور پر پڑی اس نے پر پھڑپھڑائے اور خوشی سے چلانے لگا۔ ایک ڈینے کو اٹھا کر اس نے پر سے اپنے آنسو پونچھے اور بہت صاف ستھری عربی زبان میں دونوں کو مخاطب کیا۔

"آؤ دوستو! خوش آمدید۔ تمھیں دیکھ کر میں کتنی خوش ہوں! تمھارا آنا میرے لیے مبارک ہوگا۔ میرے بارے میں یہ پیشین گوئی کی جا چکی ہے کہ ایک روز دو سارس میرے پاس آئیں گے اور ان کے آنے سے میری تقدیر سنور جائے گی۔"

خلیفہ اور وزیر سکتے میں آ گئے۔ چند لمحوں بعد خلیفہ نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے دونوں پالتو جوڑے اور گردن آگے کو بڑھاتے ہوئے کہا:

"اُلّو صاحبہ! آپ کی باتوں سے ایسا لگتا ہے کہ آپ کسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ افسوس! ہم خود ایسے حال میں ہیں کہ شاید ہی آپ کی مدد کر سکیں۔ ہم آپ کو اپنی آپ بیتی سنائیں گے۔ اس سے اندازہ کیجیے گا کہ ہم پر بھی کیسی تباہی آئی ہے۔"

اُلّو نے ان کی کہانی کے لیے اشتیاق ظاہر کیا اور خلیفہ نے سارا قصّہ کہہ سنایا۔ وہ چپ ہوا تو اُلّو بیگم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی روداد شروع کر دی۔

"اب سنو! میری کہانی سنو! میں بھی تمھاری ہی طرح بدنصیب ہوں۔ میرے باپ ہندستان کے ایک راجا ہیں۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ میرا نام لوسا ہے وہی جادوگر کشنو جس نے تمھیں دھوکا دیا، اسی نے مجھے بھی اس حال کو پہنچایا ہے۔ ایک روز میرے باپ کے پاس آیا اور بولا کہ وہ اپنے بیٹے مرزا کی شادی مجھ سے کرنا چاہتا ہے۔ میرے باپ نے دھکّے دے کر اسے محل سے باہر نکلوا دیا۔

پھر وہ بھیس بدل کر ایک دن آیا۔ میں اس وقت محل کے باغ میں تھی۔ مجھے بھوک لگی۔ میں نے کھانے کے لیے کچھ لانے کا حکم دیا۔ کشنو جادوگر نے غلام کا بھیس بدل رکھا تھا۔ وہ میرے لیے شربت بھی لے آیا۔ اور پھر اس شربت کو پیتے ہی اچانک

میں اس حال کو پہنچ گئی۔ مجھے اتنا گہرا صدمہ پہنچا کہ میں بے ہوش ہو گئی۔ کشنو نے مجھے دبوچ کر اپنے گھر کی راہ لی۔ اپنے گھر پہنچتے ہی اس نے کڑک دار آواز میں کہا ——— "اب تم اسی طرح بدصورت بنی ہوئی یہاں پڑی رہو گی۔ کوئی جانور بھی تمھیں مُنہ نہ لگائے گا۔ اس حال میں تم سے اب کون شادی کرے گا تم اسی طرح پڑے پڑے مر جاؤ گی۔ میں نے تم سے اور تمھارے مغرور باپ سے اپنی توہین کا بدلہ لیا ہے۔"

"جب سے اب تک کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ میں اداس اور اکیلی اس ویرانے میں پڑی ہوئی ہوں۔ دن بھر مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ بس رات کو جب چاندنی پھیلتی ہے مجھے اردگرد کی دنیا نظر آجاتی ہے۔"

اتنا کہہ کر اُلّو بیگم نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور پھر زور زور سے رونے لگی۔

خلیفہ کو اس پر بڑا ترس آیا۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ "ہماری اور تمھاری بدنصیبی میں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معمے کو حل کیسے کیا جائے ———؟"

اُلّو بیگم نے جواب دیا ——— "جی ہاں! مجھے یاد ہے، میرے بچپن میں ایک بوڑھی عورت نے یہ پیشین گوئی کی

تھی کہ ایک سارس کبھی نہ کبھی مجھے بدنصیبی کے جال سے نکالے گا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ گھڑی آ گئی ہے۔ ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے!"

"کیا ——؟" خلیفہ نے پوچھا۔

"کشنو جادوگر مہینے میں بس ایک بار یہاں آتا ہے۔ اس کھنڈر میں ایک بہت بڑا سا ہال ہے۔ کشنو جادوگر اسی ہال میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ کیا پتا کسی دن کشنو یا اس کا کوئی ساتھی وہ لفظ زبان پر لے آئے جسے آپ بھول چکے ہیں!"

خلیفہ کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور چونچ اٹھا کر بیقراری سے اس نے کہا —— "پیاری راج کماری! مجھے جلدی بتاؤ وہ اب کب آئیں گے!"

اُلّو بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا —— چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دھیرے سے بولی —— "آپ برا نہ مانیں تو یہ کہوں کہ میری ایک شرط ہے۔ اگر آپ وہ شرط مان لیں تو بتا دوں گی!"

"کہو کہو —— ! مجھے منظور ہے ——!" خلیفہ نے جلدی سے کہا۔

"میں اپنی حالت سے اسی صورت میں نکل سکتی ہوں

جب آپ دونوں میں سے کوئی مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے ——!"

یہ سن کر خلیفہ اور وزیر دونوں سوچ میں پڑ گئے۔

پھر خلیفہ نے وزیر کو باہر چلنے کا اشارہ کیا —— دونوں اس کمرے سے باہر نکل گئے تو خلیفہ نے کہا —— "منصو! مجھے یہ احساس ہے کہ میں تم سے ایک نامناسب درخواست کرنے جا رہا ہوں —— مگر —— تم اُلّو بیگم سے شادی کرو گے؟"

وزیر نے ذرا اونچی آواز میں کہا —— "میری بیوی —— وہ میری آنکھیں نوچ لے گی —— پھر میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ آپ نوجوان ہیں اور بہتر یہی ہوگا کہ ایک حسین راج کماری سے آپ ہی شادی کر لیں!"

"وہ تو ٹھیک ——" خلیفہ بولا —— "مگر —— مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ اُلّو بیگم واقعی حسین اور نوجوان راجکماری ہے —— مان لو ایسا نہ ہوا تو —— ؟ میں اندھیرے میں چھلانگ کیسے لگا دوں ——؟"

کچھ دیر تک وہ اسی طرح بحث کرتے رہے۔ دونوں ایک دوسرے کو قائل کرنا چاہتے تھے۔ جب وزیر پر خلیفہ کی بات کا کچھ بھی اثر نہ ہوا تو آخر کار خود خلیفہ نے اُلّو بیگم کی شرط

قبول کرلی۔

اُتّو بیگم کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا ——— اس نے کہا۔

"کشنو جادوگر آج ہی رات وہاں آئے گا ———" پھر وہ انھیں اس بڑے ہال کی طرف لے گئی۔ اس نے دونوں کو تاکید کی کہ ذرا سی بھی آواز نہ ہونے پائے ——— ایک جگہ چھپ کر انھوں نے ہال کی طرف نظریں جمادیں ——— جب اندھیرا کچھ اور گہرا ہوا تو کشنو اور اس کے ساتھی ہال میں داخل ہوئے ——— اور ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ انہی میں وہ سوداگر بھی تھا جس سے خلیفہ نے کالا سفوف

لیا تھا۔ جو آدمی سوداگر کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا اُس نے سوداگر سے خلیفہ اور منصور کا قصّہ سنانے کی درخواست کی۔ سوداگر نے قصّہ چھیڑ دیا۔

"وہ لفظ کیا تھا جسے تین مرتبہ دوہرانے پر وہ دوبارہ انسان بن سکتے تھے؟"

ایک نے پوچھا۔

"معتبر!" سوداگر نے جواب دیا۔

یہ سننا تھا کہ خلیفہ اور منصور خوشی سے اچھل پڑے، وہ تیز تیز چلتے ہوئے کھنڈر سے باہر نکل گئے۔ بیچاری اُتّو بیگم کی رفتار بہت سست تھی۔ لیکن کسی طرح لشٹم پشٹم وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے باہر نکلی۔

خلیفہ نے اُتّو بیگم سے کہا ——— "تم نے ہمیں اس مصیبت سے نکلنے کی راہ دکھائی ہے۔ تمھارے اس احسان کے بدلے میں اب میں تم سے شادی کرنے پر تیار ہوں!"

پھر خلیفہ اور وزیر مشرق کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو گئے۔ تین مرتبہ انھوں نے اپنی لمبی گردنیں جھکائیں اور ایک ساتھ چلائے ——— "معتبر ———!" اور پل بھر میں وہ سارس سے دوبارہ انسان بن گئے ——— خلیفہ اور منصور

نے ایک دوسرے کو خوش خوش گلے لگایا۔ دونوں ہنس بھی رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بھی رواں تھے۔ پھر جیسے ہی وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے انھیں اپنے قریب ہی ایک بہت

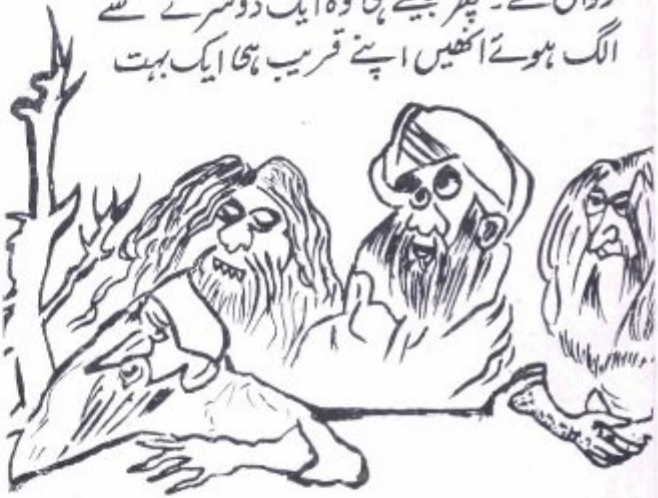

حسین راجکماری دکھائی دی ـــــ اس نے زرق برق لباس پہن رکھا تھا اور شرماشرما کر مسکرائے جا رہی تھی ـــــ آگے بڑھ کر اس نے خلیفہ کا ہاتھ تھام لیا۔

خلیفہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے جا رہا تھا ـــــ راج کماری نے ہنس کر کہا ـــــ "آپ شاید اُلّو

بیگم کو بھول گئے ـــــ!"

پھر خلیفہ اور راجکماری ایک ساتھ ہنس پڑے۔

خلیفہ نے کہا ـــــ "میں کتنا خوش قسمت ہوں۔ نہ سارس بنتا نہ اس طرح تم سے ملاقات ہوتی!"

کچھ دیر بعد وہ تینوں بغداد کی طرف چل پڑے۔ خلیفہ کو اپنی جیب میں اس کالے سفوف کے ساتھ اپنا بٹوا بھی مل گیا جس میں اشرفیاں بھری ہوئی تھیں۔ قریب کے گاؤں سے انھوں نے ضرورت کی تمام چیزیں خریدیں اور جلد ہی بغداد پہنچ گئے۔ وہاں لوگوں نے اچانک خلیفہ اور وزیر کو دیکھا تو خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ وہ تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ خلیفہ اور وزیر کہیں مر کھپ گئے۔ اپنے پیارے حکمراں کو انھوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ پھر لوگوں کا ہجوم محل میں جا گھسا۔ کشنو جادوگر اور اس کے بیٹے مرزا کو پکڑ کر لوگ خلیفہ کے سامنے لے آئے۔ کشنو جادوگر کو اسی کھنڈر میں لے جا کر پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بیٹے مرزا کو خلیفہ نے حکم دیا کہ وہ یا تو موت کی سزا قبول کرے یا پھر وہی کالا سفوف سونگھ کر سارس بن جائے۔ مرزا نے مرنے کے بجائے سارس بننا قبول

کیا۔ پھر اس کے سارس بنتے ہی خلیفہ نے اسے ایک پنجرے میں قید کر کے محل کے باغ میں رکھوا دیا۔

راجکماری سے شادی کرنے کے بعد خلیفہ نے بہت، بہت برسوں تک چین سے حکومت کی۔ کبھی کبھی وہ اپنے اس تجربے کو یاد کرتے اور خوب ہنستے۔ ان کے بچے جب یہ قصّہ سنتے تو حیران بھی ہوتے اور انھیں ہنسی بھی آتی۔

سلیم کی یہ کہانی سب نے پسند کی۔

ان میں سے ایک نے کہا ——— "وقت بہتے پانی کی طرح گزرتا جاتا ہے ——— چلو! اب ہم آگے کا سفر شروع کریں"

خیمے لپیٹے گئے اور آگے کا سفر پھر سے شروع ہو گیا۔

رات بھر وہ ٹھنڈی ہوا میں چلتے رہے ——— چلتے رہے ——— پھر صبح ہوئی ——— سورج نکلا ——— دھیرے دھیرے دھوپ پھیلنے لگی۔ جب وہ چلتے چلتے تھک گئے تو ایک جگہ قیام کی ٹھانی ——— سوداگروں نے اجنبی سوار کو محبت سے اپنا مہمان بنائے رکھا۔ ایک نے اسے تکیہ دیا۔ دوسرے نے بستر اور چند غلام اس کی خدمت پر مامور کر دیے گئے۔ پھر

جب وہ کھا پی کر فارغ ہوئے اور ساتھ بیٹھے تو سب سے کم عمر سوداگر نے سب سے بوڑھے سوداگر سے کہا ——— "سلیم کی کہانی نے وقت اچھا گزار دیا ——— آج تم کوئی کہانی سناؤ ——— احمد ———"

احمد نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک طویل سانس لی اور یوں گویا ہوا:

"دوستو ——— میں اپنی ہی زندگی کا ایک واقعہ سناؤں گا ——— میں نے یہ واقعہ آج تک کسی کو نہیں سنایا۔ مگر تم سب پر مجھے پورا بھروسا ہے اس لیے سنو ——— یہ قصّہ بھوتوں کے جہاز کا ہے ———"

بھوتوں کا جہاز

احمد نے اپنا قصہ اس طرح شروع کیا:

میرے والد ایک معمولی تاجر تھے۔ بلزورا کے مقام پر ان کی چھوٹی سی دکان تھی۔ وہ نہ تو بہت مالدار تھے، نہ ہی بہت خستہ حال۔ ان کو ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ جو کچھ بھی ان کے پاس ہے کہیں ڈوب نہ جائے اس لیے تجارت کے معاملے میں بہت محتاط تھے اور پھونک پھونک کر قدم

رکھتے تھے۔ میری پرورش انھوں نے بہت سادگی مگر توجہ کے ساتھ کی۔ جلد ہی میں اس لائق ہو گیا کہ کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ جب میں اٹھارہ برس کی عمر کو پہنچا تو میرے والد نے کاروبار کو پھیلانے کی کوشش کی۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد اچانک وہ چل بسے۔ شاید انھیں یہ احساس ہر دم ستاتا رہتا تھا کہ سمندری تجارت میں انھوں نے ایک بڑی رقم لگا دی ہے اور انھیں یہ ڈر تھا کہ ساری رقم کہیں غارت نہ ہو جائے۔ نفع کی جگہ نقصان نہ اٹھانا پڑے۔

بہر حال، جلد ہی مجھ پر یہ بات کھلی کہ ان کی موت میرے لیے مبارک ثابت ہوئی ہے۔ چند ہفتوں بعد ہی وہ جہاز جس پر اُن کا سامان لدا ہوا تھا غرقاب ہو گیا۔ اس تباہی سے میرے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ بچا کھچا سامان میں نے اونے پونے بیچ دیا اور قسمت آزمائی کے لیے پردیس جانے کی ٹھانی۔ میرے ساتھ صرف ایک شخص تھا، میرے والد کا ایک پرانا خادم۔ اُسے ہر دم میری فکر لگی رہتی تھی اس لیے اس نے میری بدحالی کے باوجود میرا ساتھ نہ چھوڑا۔

ہم ایک جہاز پر سوار ہوئے۔ اس کا رخ ہندوستان کی طرف تھا۔ ہوا ساز گار تھی۔ سفر خوشگوار ــــ پھر اچانک پندرہ روز بعد جہاز کے کپتان نے خبر دی کہ سمندر میں طوفان آنے والا ہے۔ ڈر سے اس کی آواز کانپ رہی تھی اور چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ اس راستے پر یہ اس کا

پہلا سفر تھا سوا سے کچھ بھی اندازہ اس بات کا نہ تھا کہ طوفان کیا موڑ اختیار کرے گا اور اس سے بچنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اس نے بادبان سمیٹ لیے۔ جہاز اِدھر اُدھر ڈولتا آگے بڑھتا رہا رات آئی۔ بہت ٹھنڈی اور اندھیری۔ تب کپتان کو ہوش آیا کہ اُس نے غلطی کی ہے۔

یکایک اندھیرے سے ایک اور جہاز نمودار ہوا اور ہمارے جہاز کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ اُس جہاز کے عرشے سے عجیب انوکھی اور ڈراؤنی آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ کبھی ان آوازوں پر شور کا گمان ہوتا کبھی قہقہوں کا۔ طوفان میں بھی شدّت پیدا ہوگئی تھی۔ ہمارے حواس گم ہو گئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ کپتان میرے قریب ہی چپ چاپ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ڈر جھانک رہا تھا اور چہرے کی رنگت ایک دم پیلی پڑ گئی تھی۔

"ہم اب ڈوب جائیں گے!" اس نے درد بھری آواز میں کہا ــــ "یہاں چاروں طرف موت منڈلا رہی ہے ــــ"

اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ اور پوچھتا، ہمارے جہاز کا سارا عملہ ہمارے قریب آکھڑا ہوا اور سب کے سب سسکنے لگے۔

"یہ موت کا جہاز ہے!" ایک ساتھ انھوں نے کہا:

"ہماری بدنصیبی ہمیں یہاں کھینچ لائی ہے ــــ"

ہوا کا شور اور تیز ہوگیا۔ سمندر کی سطح پہلے سے بھی زیادہ

بیقرار ہوگئی اور طوفانی لہریں خوب اونچی اونچی اُٹھنے لگیں۔ ہمارا جہاز کسی مرجھائے ہوئے پتّے کی طرح اِدھر اُدھر ڈولنے لگا۔ کپتان نے قرآن شریف کی ایک جلد نکالی اور اپنے ایک ساتھی سے درخواست کی کہ وہ تلاوت شروع کرے۔ لیکن اس وقت اللہ نے بھی ہماری دعا قبول نہ کی۔ مشکل سے ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ہمارا جہاز ایک چٹان سے ٹکرایا۔ جلدی جلدی حفاظتی کشتیاں نکالی گئیں اور ہم سب ان پر بیٹھے ہی تھے کہ ہمارا جہاز سمندر کی گہری تہہ میں اتر گیا۔

دنیا ہماری نظروں میں تاریک ہوگئی۔ لیکن ابھی تو اور بھی مصیبتیں آنی تھیں۔ طوفان کا قہر اسی طرح جاری رہا اور ہمارے لیے کشتیوں کو قابو میں رکھنا بھی دشوار ہوگیا۔ میں نے اپنے بوڑھے خادم کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا اور ہم ایک ساتھ دعا کرنے لگے کہ پروردگار ہمیں اس عذاب سے نجات دے۔ پتا نہیں کب تک ہم اسی طرح لہروں کے تھپیڑے کھاتے رہے۔ آخرکار آسمان پر صبح کی سفیدی پھیلنے لگی۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن اب ایک نئی مصیبت سر پر کھڑی تھی۔ اچانک ہماری کشتی الٹ گئی۔ جہاز کے دوسرے ساتھیوں کو پھر میں نے نہیں دیکھا۔

میں بے ہوش ہوگیا تھا۔ دوبارہ ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے وفادار خادم نے مجھے سینے سے لگا رکھا ہے اور ہم ایک کشتی پر سوار

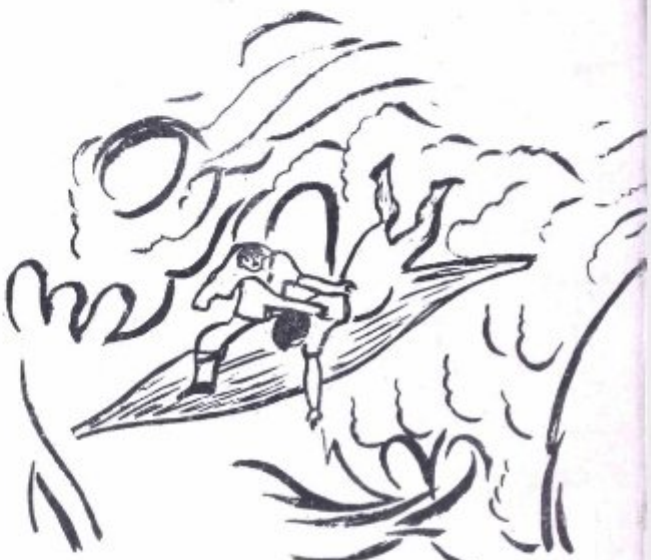

ہیں۔ خادم نے خدا جانے کن جتنوں سے ایک کشتی ڈوبنے سے پہلے پکڑ لی تھی پھر اپنے ساتھ مجھے بھی اس پر چڑھانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب ہوا ساکت تھی اور سمندر خاموش۔ دور دور کہیں طوفان کا نام و نشان نہ تھا۔ ہمارے جہاز کے آثار کہیں نظر نہ آتے تھے لیکن اچانک ایک اور جہاز ہمیں دکھائی دیا۔ اس جہاز کا فاصلہ ہم سے بہت زیادہ نہیں تھا اور دھیرے دھیرے وہ ہماری طرف آ رہا تھا۔ جب جہاز اور

قریب آ گیا تو مجھے دھیان آیا کہ یہ تو وہی جہاز ہے جس نے پچھلی رات ہمارے اوسان گم کر دیے تھے۔ ڈر کی ایک لہر سر سے پیر تک دوڑ گئی۔ مجھ پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اس ویران جہاز کو دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس پر کوئی آدم تھا نہ آدم زاد۔ اور جہاز چپ چاپ ہماری طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کیا پتا، خدا نے ہماری مدد کے لیے ہی یہ جہاز بھیجا ہو! میں اسی خیال سے چلانے لگا کہ شاید اس جہاز میں اندر کوئی چھپا بیٹھا ہو۔

جہاز کے عرشے سے ایک لمبی رسّی لٹک رہی تھی۔ اپنے ہاتھوں کو چیتوں کی طرح چلاتے ہوئے ہم کشتی اس رسّی تک لے گئے اور اسے پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے ایک بار پھر پوری قوت سے ایک آواز بلند کی مگر اس جہاز میں زندگی کا کوئی بھی نشان نہ تھا۔ بہرحال، اس رسّی کے سہارے ہم کسی نہ کسی طرح جہاز پر پہنچ گئے۔

اور پھر!

اف! جہاز پر قدم رکھتے ہی ہم نے ایک ایسا بھیانک منظر دیکھا کہ اس کے تصوّر سے بھی سر چکرانے لگتا ہے۔ جہاز پر ہر طرف خون کے دھبّے تھے اور کوئی پچیس تیس لاشیں، سب کے سب ترکی لباسوں میں ملبوس۔ سب سے بڑے بادبان کے پاس

قیمتی چمک دار کپڑے پہنے ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ اس کا چہرہ بالکل زرد تھا اور اس کے ماتھے پر ایک لمبی کیل جڑی ہوئی تھی۔ اس کیل نے بادبان کے ستون سے اسے جکڑ دیا تھا۔ وہ بھی بے جان تھا۔ میرے پاؤں پتھر جیسے ہو گئے اور سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ میرے ساتھی نے بھی جب یہ منظر دیکھا تو حیرت اور خوف کے سبب ٹھٹھک کر رہ گیا۔ بڑی مشکلوں سے ہم نے اپنے حواس درست کیے، حوصلے سمیٹے اور اللہ کا نام لے کر آگے بڑھے۔ ہر قدم پر ہمیں یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ ابھی پھر کوئی انہونی واردات نہ ہو جائے۔ ہمارے چاروں طرف حد نظر تک پانی ہی پانی تھا اور اس ویرانے میں شاید بس ہم دو ہی انسان تھے۔ ہم اس خیال سے اپنی آواز اونچی نہیں ہونے دیتے تھے کہ کہیں اس جہاز کا مردہ کپتان اچانک زندہ نہ ہو جائے یا فرش پر بکھری ہوئی لاشوں میں سے کوئی حرکت نہ کرنے لگے۔ آخر کار ہم گرتے پڑتے اُن سیڑھیوں پر پہنچے جو جہاز کے کیبن کی طرف جاتی تھیں۔ پھر ہم اچانک رک گئے۔ خاموشی سے ایک دوسرے پر نگاہ کی۔ دل کی بات زبان پر لانے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔

پھر میرا بوڑھا خادم یوں گویا ہوا:

"حضور ——— یہاں کوئی بھیانک واردات ہوئی ہے ہر طرف لاشیں، لاشیں، ان کے درمیان زندہ رہنے سے تو بہتر ہے کہ ہم آگے بڑھیں۔ ہو سکتا ہے نیچے کہیں قاتل چھپے بیٹھے ہوں۔ پھر بھی اکھلا کب تک ہم ان لاشوں کے ساتھ وقت گزار سکتے ہیں؟"

اُس نے میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔ خود میں یہی سوچ رہا تھا۔ ہم نے ہمت سے کام لینے کی ٹھانی اور نیچے چلے گئے۔ یہاں بھی چاروں طرف قبرستان کا سناٹا طاری تھا۔ بس ہمارے قدموں کی چاپ سنائی دیتی تھی۔ راہداری میں بہت دھیمی روشنی تھی۔ ہم ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔ کواڑ سے میں نے اپنے کان لگائے کہ کچھ سن سکوں۔ وہاں بھی خاموشی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور ایک بڑے سے کیبن میں قدم رکھا۔ وہاں عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ سارے فرش پر کپڑے، ظروف، اسلحے اور دوسری بہت سی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ ایک بھی ایسی چیز نہ تھی جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اپنی صحیح جگہ پر رکھی ہوئی ہے۔ کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہاں کسی زبردست ضیافت کا اہتمام کیا گیا ہوگا۔ ہم یکے بعد دیگرے تمام کیبنوں کا معائنہ کرتے پھرے اور ہماری آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔ قسم قسم کے قیمتی سامان، زر و جواہر، ملبوسات، ایک سے ایک

نادرہ کار چیزوں سے تمام کمرے اٹے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر کچھ ڈھارس بندھی۔ دل نے کہا کہ وہاں اب کوئی ذی روح نظر نہیں آتا تو پھر اس کے مالک بس ہم ہی ٹھہرے۔ کیا زبردست خزانہ ہاتھ لگا ہے! ——— میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے خادم ابراہیم نے دبی زبان سے کہا ——— "ہم زمین سے بہت دور ہیں، اس لیے کیا مال و اسباب، کیا زر و جواہر سب بیکار ہیں۔ کوئی صورت ایسی دکھائی نہیں دیتی کہ ہم بحفاظت زمین تک پہنچ جائیں۔"

ان کمروں میں کھانا بھی وافر تھا۔ طرح طرح کے لذیذ پکوان اور عمدہ عمدہ مشروبات۔ ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا اور شکر اس خدا کا ادا کیا جو اپنے بندوں کو ہر حال میں رزق دیتا ہے۔ پھر ہم دوبارہ عرشے کی طرف گئے اور ایک بار پھر ان لاشوں کو دیکھتے ہی ہمارے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی۔ ہم نے یہ طے کیا کہ ایک ایک کر کے تمام لاشوں کو سمندر میں پھینک دیں اور اس منظر سے چھٹکارا پائیں ——— لیکن۔

لیکن ——— ہم انھیں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی کھسکا نہ سکے۔ لگتا تھا کہ وہ فرش سے چپک گئے ہیں۔ انھیں اٹھانے کے لیے ہمیں تختوں کو چیرنا پڑتا۔ مگر ہمارے پاس اوزار بھی نہیں تھے۔

ذرا خیال کرو عزیزو! ہم نے جب جہاز کے کپتان کے ہاتھ سے تلوار نکالنی چاہی تو محسوس ہوا کہ اس کی بیجان انگلیوں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی ہے۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

جوں توں کر کے دن گزرا۔ شام تک ہم بھانت بھانت کے وسوسوں میں گھرے رہے۔ رات آئی تو میں نے ابراہیم سے کہا

کراب پڑکر سو رہے۔ میں ابھی کچھ اور دیر عرشے پر ٹھہرنا چاہتا تھا اور اس فکر میں تھا کہ اس عذاب سے چھٹکارے کی کوئی ترکیب ذہن میں آئے۔ اسی عالم میں دو گھنٹے گزر گئے۔ پھر چاند نکلا اور ہر طرف دودھیا روشنی پھیل گئی۔ پھر مجھے نیند سی آنے لگی۔ میں نے لاکھ چاہا کہ نیند کے غلبے سے بچوں لیکن تھکن سے برا حال تھا۔ عرشے پر ایک کونے میں لیٹ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے نیند کے بجائے غنودگی ہی کہنا چاہیے کیونکہ میں آنکھیں بند کیے کیے لہروں کے تھپیڑے اور ہوا کے جھونکوں کا شور سن رہا تھا۔ پھر اچانک ——— مجھے قریب ہی بھاری قدموں کی گونج سنائی دی اور ایک ساتھ بہت سی ملی جلی آوازیں کانوں سے ٹکرائیں۔ میں نے اٹھنا چاہا لیکن گھٹنے مفلوج ہو کر رہ گئے تھے اور میں کوشش کے باوجود اپنی آنکھیں کھول نہیں پا رہا تھا۔ آوازیں اب اور صاف ہوتی گئیں اور یوں محسوس ہوا جیسے بہت سارے لوگ نشے میں اِدھر اُدھر لڑکھڑا رہے ہیں۔ کبھی کبھی اس قسم کے احکامات بھی سنائی دیتے کہ بادبان کھول دیے جائیں یا رسیاں اور کس دی جائیں۔ دھیرے دھیرے میرے حواس جواب دیتے گئے۔ میں گہری نیند میں ڈوب گیا اور کہیں دور سے جنگی اسلحوں کے ٹکرانے کی آواز آنے لگی۔

آنکھ کھلی تو کافی وقت گزر چکا تھا۔ سورج سر پر تھا اور

اس کی تیز کرنیں میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ میں نے حیران آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ رات کی ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آئیں۔ طوفان جہاز، عجیب انوکھی آوازیں، سب خواب سی محسوس ہونے لگیں۔ ——— لیکن جب میں جمائی لیتا ہوا اٹھا تو کیا دیکھا کہ سب کچھ پچھلی شام جیسا ہے۔ عرشے پر اُسی طرح لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ جہاز کا کپتان پہلے ہی کی طرح ہاتھ میں ننگی تلوار لیے جہاز کے مستول سے چپکا ہوا تھا۔ رات کے ڈراؤنے خوابوں کا خیال آتے ہی میرے خشک ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ وہ کمرے میں بیٹھا ہوا تھا، اداس اور خیالوں میں گم۔

"میرے آقا ———!" ابراہیم نے مجھے دیکھتے ہوئے آواز دی "میں اس جہاز پر ایک اور رات گزارنے کے بجائے سمندر کی تہہ میں ڈوب جانا بہتر سمجھتا ہوں۔"

میں نے دھیمی آواز میں کہا ——— "کیوں ———؟ کیا بات ہے ———؟"

ابراہیم نے جواب دیا ——— "میں چند گھنٹوں کے لیے سویا تھا۔ پھر اپنے قریب ہی عرشے پر بھاگتے ہوئے قدموں کی گونج نے

مجھے جگا دیا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ آپ ہوں گے۔ لیکن پھر ——
پھر یہ خیال آیا کہ اتنا شور ایک اکیلے آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔
آخر کار، بھاری قدموں سے میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترا۔
اور —— اس کے بعد —— مجھے کچھ بھی یاد نہیں سوائے اُس لمحے کے جب
مجھے ہوش آیا تھا۔ ہوش آنے پر میں نے کیا دیکھا کہ وہ آدمی جو جہاز کے
مستول سے چپکا کھڑا ہے، جس کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہے اور جس کی
پیشانی پر کیل ٹھنکی ہوئی ہے —— ایک میز کے قریب بیٹھا شراب
پی رہا ہے اور گا رہا ہے۔ اس کے پاس ہی ایک اور شخص بیٹھا ہوا
ہے اور وہ بھی پینے میں مصروف ہے ——"

یہ سب سنتے ہوئے میں نے سوچا کہ جس بات کو میں خواب
سمجھ رہا ہوں وہ خواب نہیں۔ میں نے سچ مچ لاشوں کو ہنستے بولتے،
پیتے پلاتے دیکھا تھا۔ اب ایسی پراسرار مخلوق کے ساتھ آگے کا سفر کیا
کچھ تباہی نہ لائے گا —— ! اس سے نجات کی شاید کوئی صورت
نہیں —— میں نے جب مایوسی کی باتیں شروع کیں تو ابراہیم
نے ایک لمحے کے لیے غور سے میری طرف دیکھا، آہ بھری اور بولا۔
"ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے!"

"کیا؟ کیا؟ جلدی بتاؤ!" میں نے بے قراری سے کہا۔

اُس نے بتایا کہ اس کے مرحوم دادا نے جو بہت تجربہ کار جہاں دیدہ

شخص تھا اور جس نے دور دراز جنبی ملکوں کے لمبے لمبے سفر کیے تھے اور
جو بہت سی بدروحوں کو اپنے قابو میں رکھتا تھا —— اس نے
ابراہیم کو ایک بار ایک منتر سکھایا تھا۔ اس منتر کی کامیابی کا انحصار
اس بات پر ہے کہ ہم رات بھر جاگتے رہیں۔ پل بھر کے لیے بھی پلک
جھپکنے نہ پائے اور جاگتے رہنے کی ترکیب یہ ہے کہ جس وقت کبھی
آنکھیں کڑوی ہونے لگیں قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی جائے۔

میں نے بوڑھے خادم کی رائے سے اتفاق کیا۔ ہم اس کمرے
سے ملی ہوئی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں چلے گئے۔ دروازے میں کئی
غدر بڑے بڑے سوراخ کر لیے کہ ان سے آنکھیں لگا کر اندر کا سارا حال دیکھ
سکیں۔ تب ہم نے اپنی کوٹھری کے کواڑ بند کیے۔ فرش کے چاروں کونوں پر
اسمائے الٰہی میں سے چار اسم لکھے پھر اتنی تیاریوں کے بعد رات کے
آنے والے ہنگاموں کا ہم انتظار کرنے لگے۔

گیارہ بجے کے قریب مجھ پر غنودگی سی چھانے لگی۔ میں نے قوراً
قرآن شریف کی کچھ آیتیں دوہرائیں۔ حواس بجا ہوئے، نیند غائب۔
انجانے وسوسوں کا ڈر بھی کچھ کم ہوا۔ پھر اچانک عرشے پر دھما دھم کی
آوازیں گونجیں۔ رسیاں چرمرائیں۔ تختے پر بھاری قدموں کی گونج
سنائی دی اور ایک ساتھ بہت سی ملی جلی آوازوں کا شور۔ دم سادھے

سراسیمہ اور حیران، چند لمحوں تک ہم یونہی بیٹھے رہے۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ کوئی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا ہے۔ ابراہیم نے اپنے دادا کا سکھایا ہوا منتر پڑھنا شروع کر دیا۔

"تم چاہے اوپر آسمانوں سے آئے ہو
چاہے گہرے پانی کی تہہ سے
تم چاہے زمین سے آئے ہو
چاہے اُس آگ نے تمھیں جنم دیا ہو جو ہمیشہ جلتی رہے گی۔
ہمارے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ
اُس رب کے حضور جو ستاروں سے آگے ہے —"

میں یہ بتا دوں کہ جادو منتر کی باتوں پر میں نے کبھی یقین نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھی دل ابراہیم کے اس منتر کی طاقت پر بھروسے کے لیے آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں چپ چاپ سنتا رہا — سنتا رہا — اور اچانک سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ سر کے سارے بال جڑوں پر تن کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ میرے خدا! سامنے کا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ پھر وہ لمبا تڑنگا، مضبوط جسم والا کپتان جس کی لاش جہاز کے مستول سے چپکی کھڑی تھی، اسی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اس کے ماتھے پر جڑی ہوئی لمبی کیل اب تک اپنی جگہ پر تھی۔ البتہ اس کی تلوار کمر سے بندھی ہوئی تھی اور

اس کا ہاتھ خالی تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص تھا، بہت قیمتی اور زرق برق لباس پہنے ہوئے۔ مجھے یاد آیا کہ اس شخص کو بھی میں نے عرشے پر پڑی ہوئی لاشوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ کپتان کا چہرہ زرد تھا، داڑھی گھنی اور کالی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی کچھ اس انداز سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں کہ میرا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم جس دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے تھے، وہ بالکل اس کے پاس سے گزرا مگر ہم دونوں پر اس کی نظر نہیں پڑی۔ پھر کپتان اور وہ دوسرا شخص کمرے کے بیچوں بیچ پڑی ہوئی میز کے گرد بیٹھ گئے اور زور زور سے باتیں کرنے لگے۔

لیکن ہم ان کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھے کیونکہ وہ کسی عجیب و غریب زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس گفتگو کے دوران کبھی کبھی ان کی آواز چیخ جیسی سنائی دیتی اور ان کے لہجے میں تیزی آ جاتی۔ لگتا وہ غصے میں ہیں۔ اسی جوش میں کپتان میز پر "مکے" مارنے لگا۔ ماحول کچھ اور ڈراونا ہو گیا۔ دفعتاً وہ دوسرا شخص بالکل وحشیوں کے انداز میں قہقہے لگانے لگا اور اُٹھتے ہوئے کپتان کو اپنے ساتھ آنے کا اشارا کیا۔ کپتان اُٹھ کھڑا ہوا اور کمر سے تلوار کھینچ لی۔ پھر دونوں کمرے سے نکل گئے۔ ہم نے اطمینان کا ایک سانس لیا۔ ایسا لگا کہ کوئی بہت بڑی بلا سر سے ٹل گئی ہے۔ مگر یہ ہماری خام خیالی تھی۔ ابھی تو اور بھی بہت کچھ ہونا تھا۔ عرشے پر شور و غل پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا۔ ہمیں ایسا

لگا کہ لوگ بھاگ رہے ہیں، دوڑ رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، پاگلوں جیسی آوازیں نکال رہے ہیں اور قہقہے لگا رہے ہیں۔ پھر یہ ہنگامہ اتنا بڑھ گیا، اتنا بڑھ گیا کہ پورا جہاز ڈولنے لگا۔ ہم دم سادھے کھڑے رہے۔ ہمیں ڈر لگ رہا تھا کہ ایک دو پل میں جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائے گا۔ اسلحوں کی جھنکار، چیخ پکار، ڈانٹ ڈپٹ کا شور اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔

کچھ دیر بعد سناٹا چھا گیا، بالکل اچانک۔ جب کافی دیر تک کوئی آواز سنائی نہیں دی تو ہم دروازے کی اوٹ سے باہر نکلے اور ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے۔ پھر ہم سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر پہنچے۔ اب سارا ماحول بدل چکا تھا۔ کپتان کی لاش جہاز کے مستول سے چپکی کھڑی تھی اور عرشے پر اِدھر اُدھر لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔

ہم نے ایک بار پھر کوشش کی کہ لاشوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں۔ اس بار بھی ناکامی ہوئی۔ ابراہیم کا منتر بیکار ثابت ہوا۔ اگلی رات بھی وہی تماشا ہوا اور اس سے اگلی رات بھی وہی شور وغل، ہنگامہ، مار کاٹ، مجنونانہ چیخیں اور دیوانہ وار قہقہے۔ پھر سناٹا۔ سارا ڈراما حوں کا توں دوہرایا جاتا رہا۔

میں اور ابراہیم گھنٹوں اس تباہ حالی پر گفتگو کرتے رہے۔ لیکن اس عذاب سے نکلنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی سوائے اس کے کہ جہاز کو کسی طرح اس جگہ سے کھسکایا جائے اور ہم سمندر کو پار کرتے ہوئے زمین تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ بظاہر یہ کام دو آدمیوں کے بس کا نہیں تھا۔ مگر سمندری سفر کا ہمیں خاصا تجربہ تھا اس لیے ہم نے سوچا کہ پچھلے تجربوں سے کچھ فائدہ اٹھایا جائے۔ ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ میں نے کچھ اوزار جہاز کے نچلے کیبن میں ڈھونڈ نکالے اور ہزار جتنوں کے بعد جہاز کا رخ مشرق کی سمت موڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمیں امید تھی کہ اس طرح ہم جلد ہی خشکی تک پہنچ جائیں گے۔

سفر کے پہلے دن ہوا نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ جہاز کی رفتار خاصی تیز اور تسلی بخش رہی۔ لیکن رات آتے ہی ہوا کا رُخ ایک دم بدل گیا اور اس کے تھپیڑے ہمارے چہروں سے ٹکرانے لگے۔ اب جہاز کو ہوا کی مخالف سمت میں لے جانا مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آتا تھا۔ ہماری ہر کوشش بے کار گئی۔ جہاز اگر چند گز آگے بڑھتا تو کوئی ان دیکھی قوت اسے پل بھر میں کئی گز پیچھے دھکیل دیتی۔ حواس تو گم تھے ہی، اسی عالم میں آنکھیں

بھی بوجھل ہونے لگیں۔ اس حال میں عرشے پر جمے رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ رات کا اندھیرا ذرا اور گہرا ہوتے ہی تمام لاشیں ایک بار پھر حرکت کرنے لگیں گی اور ان کی پرانی جنگ کا سلسلہ پھر شروع ہو جائے گا۔ نا چار ہم نیچے چلے گئے اور اللہ کا نام لے کر دروازے کی اوٹ میں فرش پر پڑ رہے۔ ہم اتنے تھکے

ہوئے تھے کہ اس رات ہمیں گہری نیند آئی۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو پتا چلا کہ ہم جہاں سے چلے تھے ٹھیک اسی مقام پر دوبارہ واپس آ گئے ہیں۔ یہ حقیقت کتنی بھیانک تھی! ہماری ساری محنت اکارت گئی تھی ہمارا دل ڈوبنے لگا، یہ سوچ کر کہ زندگی میں اس عذاب سے چھٹکارا پانا شاید ہمارے مقدر میں نہیں ہے۔ بھوتوں سے بھرے ہوئے اس جہاز پر ہم بھلا کتنے دن گزار سکتے تھے؟ آخر ایک نہ ایک دن کھانے پینے کا سامان ختم ہونا تھا۔ پھر؟ پھر کیا ہوگا؟ فاقوں کی موت؟ ہم جتنا سوچتے جاتے دل اتنا ہی بیٹھتا جاتا۔ ہم نے سوچا کیوں نہ اپنے آپ کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیں۔ یہ موت اس ڈر کے عذاب سے تو بہتر ہوگی! مگر ابراہیم نے کہا— ایک بار پھر اسی منتر کو آزمایا جائے۔ عزیزو! امید بھلا کب، کس حال میں، انسان کا ساتھ چھوڑتی ہے؟ میں نے حامی بھر لی کہ شاید اس بار خدا ہماری فریاد سن لے۔ ہم نے اس منتر کی کئی نقلیں تیار کیں اور انھیں تعویذ کی شکل دے کر جہاز کے یاد بانوں سے لٹکا دیا۔ دن بھرا ہوا ساز گار رہی اور ہمارا سفر جاری رہا۔ رات آئی تو پھر بھانت بھانت کے وسوسے پریشان کرنے لگے۔ خدا کا شکر ہے کہ رات کافی دیر تک،

جب تک ہم جاگتے رہے، ہوا کا رخ ہمارا ساتھ دیتا رہا۔ ہم نے شکریہ ادا کیا کہ خدا نے ہماری دعا سن لی تھی۔

اگلے روز نیند اچٹنے پر ہم نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔

یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں جہاز پھر اسی جگہ واپس نہ آ گیا ہو۔ — مگر اب کے ایسا نہیں ہوا تھا — ابراہیم کا منتر کام کر گیا تھا اور ہم نے کافی راستہ طے کر لیا تھا۔ آگے کے سات دن اور سات راتیں بھی اسی طرح ساتھ خیریت کے گزریں۔ کوئی انہونی بات نہیں ہوئی۔ سفر سلامتی سے جاری رہا اور ہم آگے بڑھتے گئے۔ پھر اے عزیزو! آٹھویں دن کی صبح آئی اور ہمارے لیے مسرت کا پیغام لائی۔ میں اور ابراہیم سربسجود ہو گئے کہ خداوند کریم نے ہماری التجا بالآخر قبول کر لی تھی اور اب زمین کا کنارا ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ ہم نے شکرانے کی نماز پڑھی۔ دن بھر اور رات بھر ہم نے ساحل کے ساتھ ساتھ اپنا سفر جاری رکھا اور دوسرے دن ہمیں ایک شہر کے آثار دکھائی دیے۔ برجیاں، محرابیں، مینار، گنبد اور شہر پناہ کے جھروکے سامنے تھے۔ ہم نے ایک چھوٹی سی کشتی نکالی۔ جہاز کے بادبان سمیٹے اور لنگر ڈال دیے۔ پھر اس کشتی پر بیٹھ کر زمین تک پہنچے۔ شہر پناہ کے پھاٹک تک رسائی آدھے گھنٹے میں ہوئی۔ وہاں ایک

راہ گیر نظر آیا۔ اس نے حیرت سے ہم اجنبیوں پر نظر کی۔ ہمیں پردیسی جان کر ہماری مدد کو آیا اور ہمیں بتایا کہ سامنے آبادی ملک ہندستان کے ایک شہر کی ہے۔ ہمارے دل خوشی سے کھل اٹھے۔ ہم یہ ہزار خرابی وہیں پہنچ گئے تھے جہاں پہنچنا چاہتے تھے۔ راہ گیر سے پتا نشان پوچھ کر ہم نے ایک سرائے کی راہ لی کہ قیام کا انتظام کریں اور سفر کی تکان دور ہو۔ سرائے کا مالک بھی عزت سے پیش آیا۔ ہمارے لیے خوب عمدہ لذیذ کھانا تیار کیا۔ ہم نے ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد حقے کی گڑگڑی لگائی اور اس سے پوچھا کہ اس آبادی میں کوئی بزرگ ایسا بھی ہے جو کچھ جادو ٹونے کا علم رکھتا ہو؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں ایک بزرگ ایسا اسی بستی میں موجود ہے۔ پھر وہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گیا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم اس کے ساتھ چلے۔ وہ ہمیں ایک تنگ سی گلی میں لے گیا اور ایک معمولی سے مکان کے دروازے پر رک گیا۔ پھر اس نے ہمیں بتایا کہ وہ مرد بزرگ اسی مکان میں رہتا ہے اور اس کا نام یلیج ہے۔ اس کے کہنے پر ہم اس مکان میں داخل ہو گئے۔

اندر ایک بوڑھا دکھائی دیا، سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید۔ اس نے پوچھا! "کیا چاہتے ہو —؟" ہم نے کہا — "یلیج سے ملنا چاہتے ہیں!"۔ اس نے جواب

دیا کہ یلیج وہ خود ہے۔

ہم نے اپنی پوری کہانی کہہ سنائی۔ سفر کا سارا حال بتایا۔ پھر اس سے سوال کیا کہ ان لاشوں کو کس طرح جہاز سے ہٹایا جائے؟

یلیج نے کہا کہ اس کی صرف ایک صورت ہے۔ ان لاشوں نے اپنی زندگی میں کسی بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور عذاب

میں مبتلا ہیں۔ اب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ جس تختے پر لاش چپکی ہوئی ہے اُسے جہاز سے اکھاڑ کر خشکی پر لایا جائے۔ اس طرح سارا سحر ٹوٹ جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ ہم اسے بالکل راز رکھیں اور آدمی تو آدمی کسی پرند کو بھی اس واقعے کی ہوا نہ لگے۔ اس منصوبے میں کامیابی کے بعد جہاز کے سارے خزانے پر ہمیں پورا اختیار ہوگا۔ یلیج نے بس یہ مطالبہ کیا کہ ہم اسے انعام کے طور پر اس خزانے کا ایک حقیر سا حصہ دے دیں۔ اس کے بدلے میں وہ اور اس کے چند غلام لاشوں کو جہاز سے اٹھانے میں ہماری مدد کریں گے۔ ہم نے اس کی شرط مان لی۔ وہ خود اور اس کے پانچ غلام ہمارے ساتھ ہو لیے۔ ان کے پاس بڑی بڑی کلہاڑیاں اور کچھ دوسرے اوزار تھے۔

ہم جہاز پر واپس پہنچے تو وقت تھوڑا ہی گزرا تھا۔ دھوپ میں زیادہ تیزی نہیں آئی تھی۔ ہم نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا۔ گھنٹے بھر میں ہم نے چار لاشیں وہاں سے تختوں کے نکال لیں۔ یلیج کے چند غلام لاشوں کو دفنانے کے لیے کنارے پر لے گئے۔ لوٹ کر انھوں نے بتایا کہ جوں ہی لاشوں کو انھوں نے زمین پر رکھا وہ خود

بخود مٹی کے تودوں کی طرح بکھر گئیں اور وہ قبریں کھودنے اور انھیں دفنانے کی زحمت سے بھی بچ گئے۔ دن بھر ہم لگاتار محنت کرتے رہے۔ شام ہوتے ہوتے ساری لاشیں کنارے تک پہنچا ہی گئیں اور آپ ہی آپ ٹھکانے لگ گئیں۔ زمین پر پہنچتے ہی وہ لاشیں خود بخود مٹی کی طرح بکھر جاتی تھیں۔ مٹی مٹی میں مل گئی۔

اب صرف کپتان کی لاش بچی تھی، جہاز کے مستول سے چپکی ہوئی۔ ہم نے اس کے ماتھے سے کیل نکالنی چاہی۔ مگر ناکام ہوئے۔ ہم بال بھر بھی اُسے ہلا نہ سکے۔ یا خدا! یہ کیا معمہ ہے؟ اب جہاز کے پورے مستول کو کس طرح جہاز سے الگ کر کے زمین تک لے جایا جائے؟ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لیکن بلیج کے پاس اس سوال کا جواب بھی موجود تھا۔ اس نے ایک غلام کو حکم دیا کہ ایک برتن لے کر کنارے پر جائے اور اسے مٹی سے بھر کر واپس لائے۔ غلام حکم بجالایا۔ بلیج نے برتن اپنے ہاتھ میں سنبھالا۔ منھ ہی منھ میں کوئی منتر پڑھا اور چٹکی بھر مٹی برتن سے نکال کر کپتان کی لاش پر چھڑک دی۔ اچانک کپتان نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ پتلیاں حرکت میں آگئیں۔ پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور اس کی پیشانی سے زخم کی جگہ پر خون کا فوارہ سا ابل پڑا۔ اب وہ کیل آسانی سے نکل آئی اور وہ بے سدھ ہو کر ایک غلام کے

بازوؤں میں جھول پڑا۔

"یہاں مجھے کون لایا ہے؟" چند لمحوں بعد اس نے سوال کیا۔ بلیج نے جواب دینے کے بجائے بس انگلی اٹھا کر میری طرف اشارہ کیا۔

"میں تمھارا شکر گزار ہوں پیارے اجنبی!" کپتان نے کہا ——— "تم نے بہت بڑے عذاب سے مجھے نجات دلائی ہے۔ پچھلے پچاس برس میں نے اسی تکلیف میں گزارے ہیں۔ ہر رات میری رُوح جسم میں لوٹ آتی تھی اور مجھ سے کہتی تھی کہ زمین پر چلو! آج میرے ماتھے پر مٹی لگتے ہی میری روح کو قرار آگیا ہے۔ اب میں اپنے عزیزوں تک پہنچ جاؤں گا!"

میں حیران ہوا۔ پھر اس سے درخواست کی کہ وہ اپنا قصّہ پورے کا پورا سنائے۔

اس نے اپنا قصّہ اس طرح شروع کیا: "اب سے پچاس برس پہلے، میں الجزائر کا ایک معزز شہری تھا۔ پھر بدی کا نشہ مجھ پر طاری ہوا اور سر میں سمائی کہ کسی ترکیب سے دولت حاصل کروں۔ سو میں نے ایک جہاز خریدا اور سوچا کہ سمندروں میں آتے جاتے تجارتی جہازوں کا مال لوٹا جائے۔

وقت گزرتا رہا۔ ایک روز ایک درویش ہمیں ملا اور ہم سے درخواست کی کہ اپنے جہاز پر ہم اُسے کچھ دور پہنچا دیں۔ میرے

ساتھی بدمعاش قسم کے لوگ تھے۔ درویش سے بھی وہ ہنسی مذاق کرتے رہتے۔ اس پر پھبتیاں کستے۔ اسے تنگ کرتے آخر ایک روز درویش کو جلال آگیا۔ اس نے ہمیں بد دعا دی۔ میں اس وقت اپنے ایک رفیق کے ساتھ مے نوشی میں مصروف تھا۔ مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے خنجر نکالا اور اسے سیدھا درویش کے قلب میں اتار دیا۔ درویش نے مرتے مرتے ہمیں ایک اور بد دعا دی۔ "تم جب تک زمین پر نہیں پہنچ جاتے، نہ مردوں میں ہوگے نہ زندوں میں!" یہ کہتے کہتے اس نے اپنی آنکھیں موند لیں اور جان سے گزر گیا۔ ہم سب نشے میں تھے۔ اس کی بد دعا کا بھی ہم نے کچھ اثر نہ لیا اور اس کی لاش سمندر میں پھینک دی۔ آخر کار اس کی بد دعا رنگ لائی۔ اسی رات میرے کچھ ساتھی کسی بات پر مجھ سے ناخوش ہوگئے اور میرے خون کے پیاسے نظر آنے لگے۔ میں اور میرے چند رفیق ایک طرف تھے۔ بقیہ دوسری طرف۔ دونوں جتھوں میں زبردست جنگ ہوئی۔ ہم ہار گئے۔ دشمنوں نے مجھے مستول سے لگا کر میری پیشانی میں ایک لمبی میخ ٹھونک دی۔ میرے بقیہ ساتھی بھی مارے گئے۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ ساتھی جو ہمارے دشمن ہوگئے تھے اپنے زخموں کی تاب نہ لا کر یکے بعد دیگرے چل بسے۔ جہاز ایک قبرستان

بن گیا۔ میری آنکھوں کی روشنی کم پڑتی گئی اور سانس رک رک کر چلنے لگا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ میں بھی بس تھوڑی دیر کا مہمان ہوں۔ لیکن میں پوری طرح مرنے کے بجائے ایک قسم کے فالج کا شکار ہوگیا تھا۔ اگلی رات، ٹھیک اسی وقت جب ہم نے درویش کی لاش سمندر میں پھینکی تھی، مجھے ایسا لگا کہ ایک بار پھر میں زندہ ہوگیا ہوں۔ میرے تمام ساتھی بھی کروٹ لے کر اٹھ بیٹھے۔ ہم سب ہوش میں تھے۔ لیکن صرف وہی کرنے پر مجبور جو کچھ ہم نے پچھلی رات کیا تھا۔ اے عزیز! پچاس برس اسی حال میں گزر گئے۔ ہم مُردوں میں ہیں نہ زندوں میں۔ پھر ہم بھلا کیوں کر زمین تک پہنچ سکتے تھے؟ ہم تو یہ دعا بھی کرتے تھے کہ کوئی بھیانک طوفان آئے اور جہاز کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ شاید اس طرح ہم ڈوب کر سمندر کی تہہ تک جا پہنچیں اور مٹی کا لمس ہمیں کھوئی ہوئی زندگی بخش دے۔ لیکن ہماری قسمت میں یہ بھی نہ تھا۔ اب میں مر تو سکتا ہوں! میرے عزیز! تم نے اس قہر سے مجھے نجات دلائی ہے میں تمھارا شکر گزار ہوں اور اظہار تشکر کے طور پر اپنا جہاز اور اپنا سارا خزانہ، مال و اسباب، جو کچھ بھی جہاز پر ہے، تمھاری نذر کرتا ہوں ——!"

یہ کہتے کہتے کپتان لڑھک گیا۔ ہم اسے بھی کنارے لائے

اور اس کا بدن بھی خاک ہو کر مٹی میں مل گیا۔ ہم نے اس کی مٹی ایک صندوقچے میں سمیٹی پھر اس صندوقچے کو کنارے ہی پر دفن کر دیا۔

اب ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور دوسری باتوں پر توجہ کی۔ سب سے پہلے تو ہم نے یہ کیا کہ ملیح اور اس کے غلاموں کو ڈھیر سارے تحفے تحائف، انعام واکرام سے نوازا۔ پھر کچھ ملازم تلاش

کیے جو آگے کے سفر اور تجارت میں ہمارا ہاتھ بٹا سکیں۔ پھر ہم نے مزدور اور کاریگر بلوائے اور ان سے جہاز کی مرمت کرائی۔ جہاز پر جو مال و اسباب لدا ہوا تھا اسے شہر لے جا کر بیچ دیا اور بدلے میں دوسری انواع و اقسام کی چیزیں خریدیں۔ خوب نفع کمایا۔ پھر کاروبار میں خدا نے اتنی برکت دی کہ نو مہینے بعد جب میں ملک ملک کی سیر کرتا، طرح طرح کے عجائبات دیکھتا ہوا واپس اپنے وطن بغداد پہنچا تو دوست عزیز، پڑوسی اور اہل شہر میرا ٹھاٹ باٹ دیکھ کر حیران ہوئے۔ کچھ نے حسد کیا۔ کچھ خوش ہوئے اور رشک کیا۔ بعضے یہ سمجھے کہ اس حقیر فقیر نے شاید جواہرات کی وہ وادی ڈھونڈ نکالی ہے جس کی کھوج سندباد جہازی کو تھی۔

عزیزو! جب سے اب تک یہ رسم چلی آتی ہے کہ بغداد کا ہر نوجوان عمر کے اٹھارویں برس کی حد پار کرتے ہی قسمت آزمائی کے لیے میری طرح گھر چھوڑ کر نکل جاتا ہے اور شکر ہے اُس پروردگار کا کہ اُس کے کرم سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ نفع کماتا ہے پھر وطن لوٹ آتا ہے۔ میں نے واپسی کے بعد سے آسائش کی زندگی گزاری ہے۔

ہر پانچویں برس حج کو جاتا ہوں اور خدا کے حضور

سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ بھوتوں کے جہاز کا کپتان اور اس کے جاں نثار رفیقوں کی خطائیں اللہ معاف کرے اور ان کی مغفرت فرمائے۔"

اگلے روز قافلے نے ایک اور منزل طے کر لی۔ پھر جب اہلِ کارواں سفر کی تکان اتارنے کے لیے ایک پُر فضا مقام پر قیام کے ارادے سے رُکے اور کھا پی کر ساتھ بیٹھے تو سلیم نے اپنے ساتھیوں میں اسے جو سب سے کم عمر تھا، مخاطب کیا اور کہا:

"تم عمر میں ہم سے چھوٹے ہو اور تمھاری صحت کی شادابی دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ تم نے کبھی رنج نہیں کھینچے۔ سو اب تم ہمیں کوئی دلچسپ قصّہ سناؤ تاکہ اگلے سفر کے لیے ہم تازہ دم ہو سکیں۔"

اس نوجوان نے کہ نام جس کا ملیج تھا یہ سُن کر ایک قہقہہ لگایا اور بولا:

"تمھارا حکم سر آنکھوں پر! مگر رسم دنیا ہے کہ چھوٹے اپنے بڑوں کو پہلے موقع دیتے ہیں۔ زالیوکوس عمر اور تجربے میں میرے بزرگ ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آٹھوں پہر وہ کسی سوچ میں گم رہتے ہیں اور چہرے پر متانت چھائی رہتی ہے۔ ہم پہلے ان سے ان کی کہانی سنیں تاکہ ان کی اداسی کا کچھ بھید کھلے!"

زالیوکوس ایک یونانی تاجر تھا، حسین چہرہ، مضبوط جسم اور عمر بھی ابھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ یہ بات اور ہے کہ اس کے چہرے پر ہمیشہ سنجیدگی اور اداسی طاری رہتی۔ اس کا عقیدہ اس کے ساتھیوں سے مختلف تھا، پھر بھی سب اُس کی عزت کرتے تھے اور اس کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے۔ زالیوکوس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا۔

ملیج کی باتیں سُن کر اس نے ایک پل کی خموشی کے بعد دھیرے سے کہا۔

"یہ میری عزت افزائی ہے۔ میں تم سب سے اپنا کوئی راز چھپا کر نہیں رکھنا چاہتا۔ دیکھو! میرا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ میں تمھیں بتاؤں گا۔ تب تم خود ہی جان جاؤ گے کہ میری اداسی کا بھید کیا ہے۔ تمھیں یہ پتا بھی چل جائے گا کہ میں اتنا چپ کیوں رہتا ہوں۔ تو سنو! یہ کہانی کٹے ہوئے ہاتھ کی ہے ——"

(اگلی کہانی اس سلسلے کی اگلی کتاب میں)

مکتبہ پیام تعلیم کی چار نئی کتابیں

اسلام کے مشہور سپہ سالار عبدالواحد سندھی

بچوں کے لیے اسلام کے مشہور سپہ سالاروں کا تفصیلی تعارف نیز ان کی زیر قیادت لڑی گئی جنگوں کے حالات جن کے پڑھنے سے ایمان میں تازگی آتی ہے۔ حصہ اول حصہ دوم

اسلام کے مشہور امیر البحر عبدالواحد سندھی

اس کتاب میں مسلمانوں کے جہاز سازی اور جہاز رانی کے کارنامے نیز ان سمندری سپہ سالاروں کے حالات بتائے گئے ہیں جنھوں نے تاریخ میں نام اونچا کیا۔ قیمت

موم کا محل پروفیسر محمد الیاس

شہد کی مکھیوں کی کہانی جو خود شہد کی طرح میٹھی اور دل پسند ہے۔ بڑے بچوں کے لیے کہانی کی طرز پر لکھی گئی ایک عمدہ معلوماتی کتاب۔

قیمت

پہیلیاں مرتبہ: ڈاکٹر سیفی پریمی

کھیل ہی کھیل میں بچوں میں تجسس اور کھوج کی عادت ڈالنے کا بہترین ذریعہ

قیمت

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵